۹۲

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

# کیا اقبالؒ فلسفی تھے؟

ڈاکٹر سید عطاء الرحیم

گُریز از آنکه ندیدست و جُز خبر ندهد
سخن دراز کند لذتِ نظر ندهد

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

# کیا اقبالؒ فلسفی تھے؟

97

میرے خیال میں ابھی تک اقبال کی فکر کا پوری طرح سے تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ ان کے فلسفہ پر مغرب اور مشرق کے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں ان کا بھرپور تجزیہ نہیں کیا گیا ہے۔ چند لوگوں نے کام کیا ہے جیسے پروفیسر ایم۔ ایم۔ شریف، خلیفہ عبدالحکیم، بی۔ اے۔ ڈار، ڈاکٹر رفیع الدین، ڈاکٹر عشرت حسن انور، ایس۔ اے واحد وغیرہ نے اقبال اور مغربی مفکرین کا جائزہ لیا ہے اور یہ دیکھا ہے کہ ان سے کس حد تک متاثر تھے۔ انہوں نے ان کے کن پہلوؤں کو اپنایا تھا اور کس پر تنقید کی تھی۔

بلاشبہ اقبال ایک عظیم شخصیت تھے۔ ان کی شاعری اور فلسفہ میں کئی تصورات کا پتہ چلتا ہے جو کہ نہ صرف مختلف بلکہ بعض اوقات متضاد ہیں۔ ابتدا کے اقبال وطن پرست تھے (ہمالیہ، ہندوستان ہمارا کے خالق۔ اسی لیے ہندوستان والے ان کو اس رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے اسلامی رنگ کو دبا دیتے ہیں)۔ مغرب سے آشنا ہونے کے بعد وہ اشتراکی فلسفہ، نطشے، برگساں وغیرہ سے متاثر ہوتے۔ وہ مختلف شخصیتوں مثلاً مارکس، لینن، مسولینی، نطشے، برگساں وغیرہ کی تعریف کرتے ہیں اور ان پر تنقید بھی کرتے ہیں۔ نطشے کے انسان اعلیٰ کو مردِ مومن کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ آئن سٹائن، میکٹیگارٹ اور برگساں کے تصورِ زمان سے متاثر ہیں۔ وہ اس تصوف کے معترض ہیں جو ہمیں زندگی کی جدوجہد سے الگ کر کے خانقاہوں میں بٹھا دے۔ وہ حافظ کے ناقد اور مولانا روم کے مرید ہیں کیونکہ مولانا روم ان کو عمل کا درس دیتے ہیں۔ غرض مشرق اور مغرب کے بہت سے رجحانات اور نظریات کا ذکر ہمیں اقبال میں ملتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ان سب کو بہت اچھی طرح سمجھا تھا۔ آخر میں جو چیز ان کو کھینچتی ہے وہ اسلام کا فکری نظام ہے جس کی بنیاد مردِ مومن پر ہے۔ ان کا فلسفۂ خودی مردِ مومن کے گرد گھومتا ہے۔

اس سرسری جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال فلسفی تھے اور انہوں نے فلسفیانہ نظریات کا گہرا مطالعہ کیا تھا

وہ فلسفہ کے طالب علم اور اس کے استاد تھے۔ انہوں نے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کیا۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا: "ایران میں مابعد الطبیعیات کی ترقی"۔ انہوں نے کیمبرج اور میونخ یونیورسٹی میں فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ عظیم فلسفیوں میں میکٹیگارٹ اور برگسان سے ملے تھے۔ مغرب کے سیاست دانوں میں وہ مسولینی سے بھی ملے تھے۔

میرا مضمون ایک سوال کی صورت میں ہے کیا علامہ اقبال فلسفی تھے؟ ہماری نجی محفلوں میں شخصیات، مسائل اور نظریات پر جس طرح بات ہوتی ہے اور ان پر جس طرح تنقید کی جاتی ہے اس کا ضبط تحریر میں لانا مشکل ہے۔ اس سے فساد کا اندیشہ ہوتا ہے۔ آج کل نظریۂ پاکستان، قائداعظمؒ اور زبان کے مسئلہ پر جو بحث ہوتی ہے وہ بھی تکلیف دہ ہے۔ ایسی ہی ایک محفل میں یہ سوال اٹھا کہ کیا اقبال کو فلسفی کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے ایک ساتھی اور دوست کا جو فلسفہ کے استاد ہیں یہ موقف ہے کہ اقبال فلسفی نہ تھے (ان کو ایک عظیم فلسفی کہنا اور بھی بڑی غلطی ہے)۔ ان کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ان کے نزدیک اقبال نے اپنے فلسفہ کو منضبط طریقے پر پیش نہیں کیا۔ فلسفہ کے تعلق سے صرف ان کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ اور ان کے خطبات ہیں (اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل نو)۔ ان کے خطبات میں بہت سے مسائل الجھے ہوئے ہیں۔ ان سے کوئی واضح فلسفہ تشکیل نہیں پاتا ہے۔ وہ ان کو ایک عظیم شاعر ضرور مانتے ہیں لیکن جب ان کی شاعری کے ذریعے سے ان کے فلسفہ کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے تو مشکل پیدا ہوتی ہے۔ شعر جذبات و احساسات کی زبان ہے جبکہ فلسفہ منطق کا مرہون منت ہے۔ جذبات و احساسات میں تضاد ممکن ہے لیکن فلسفہ میں یہ ممکن نہیں ہے۔ اقبال کا مارکس، لینن، مسولینی، نطشے، برگساں وغیرہ سے متاثر ہو کر کچھ نظم کرنا اور بات ہے اور ان کے نظریات پر تنقید کرنا اور چیز ہے۔ ابتدا سے مشرق اور مغرب میں فلسفہ کی زبان نثر رہی ہے جس میں فلسفی اپنے نظریات کو دلائل کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اگر اقبال نثر میں خطبات کے علاوہ اور کوئی کتاب لکھ جاتے تو شاید ان کے فلسفہ کو سمجھنے میں آسانی ہوتی۔

۲۔ ان کے نزدیک ایک مشکل اور ہے۔ اگر اقبال کو شاعری کے ناطے سے فلسفی مانا جائے تو پھر میر، غالب، شیکسپیئر، گوئٹے وغیرہ بھی فلسفی ٹھہرے گو ہم ان کو شاعر کہتے ہیں۔ فلسفہ اور شعر میں کوئی نہ کوئی حد فاصل کھینچنی ہوگی ورنہ ہر بڑا شاعر فلسفی بن جائے گا۔ اسی اعتبار سے بہت سے نثر نگار جیسے عظیم ناول نگار ٹالسٹائی وغیرہ بھی فلسفی بن جائیں گے۔ بہر حال ایک ناول اور فلسفہ کی کتاب میں تمیز کرنی ہوگی۔

۳۔ میرے دوست نے کہا کہ فلسفہ کی تاریخ میں ہمیشہ اس کو جگہ دی جاتی ہے جو کسی نئی فکر یا نئی راہ کا تعین کرتا ہے جیسے افلاطون، کانٹ، ہیگل، مارکس وغیرہ۔ اقبال ان لوگوں کے ساتھ نہیں رکھے جا سکتے کیونکہ انہوں نے فلسفہ میں کسی فکر کا اضافہ نہیں کیا۔ مشرق اور مغرب کے فلسفیوں سے متاثر ہو کر انہوں نے ایک درمیانی راہ نکالی ہے۔ وہ اسلام کا احیاء چاہتے ہیں اور اسلام کے ذریعے جدید تقاضوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ اسلامی فکر کوئی نئی چیز نہیں ہے (۱۲

سو سال ہے اس کے متعلق سنتے آئے ہیں) اس لیے اقبال کا فلسفہ بھی نیا نہیں ہے۔

۴۔ انہوں نے کہا کہ وہ اقبال کی تحریروں میں ان کے خودی کے فلسفہ کو اہمیت دیتے ہیں۔ مغرب کے فلسفیوں نے ذات، انا یا خودی پر بہت کام کیا ہے۔ اقبال ان سے متاثر تھے۔ اگر ان لوگوں کے افکار کی روشنی میں اقبال کے فلسفۂ خودی کا مطالعہ کیا جائے تو کوئی نئی بات بن سکتی ہے۔ مثلاً وجودیت کے فلسفہ نے انسان کے وجود اور اس کے مسائل کی طرف توجہ دی ہے۔ اگر اقبال کے تصورِ خودی کو وجودی معنی دیئے جائیں تو یہ ایک نئی بات ہوگی جس سے مغرب کے لوگ بھی متاثر ہوں گے۔ خودی کی اسلامی تشریح اہم ضرور ہے لیکن اس میں کوئی نیا پن نہیں ہے۔

۵۔ ایسا لگتا ہے کہ اقبال نے بین الاقوامی شہرت کو حاصل کرنے کے لیے فارسی کو اپنایا۔ ان کا زیادہ تر فلسفیانہ کلام فارسی میں ہے (اسرارِ خودی، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد وغیرہ)۔ اس کے ذریعے وہ مغرب میں متعارف ہونا چاہتے تھے۔ اردو میں اس اعتبار سے ان کا کلام کم ہے اور کم درجے کا ہے۔ ابتدائی اردو کلام تو سہل لیکن بعد کا کلام فارسی آمیز ہے۔ ہمارے پاکستان کی زیادہ آبادی فارسی سے ناآشنا ہے اور یہ ناآشنائی دن بہ دن زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے اقبال کو ایک عوامی/قومی شاعر کا درجہ نہیں دیا جا سکتا ہے کیونکہ انہوں نے یہاں کے عوام کے لیے شاعری نہیں کی۔ ان کا کلام ایک خاص تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے ہے۔ ان کی ابتدائی شاعری میں عام آدمی کے لیے بہت کچھ تھا (بچوں کے لیے نظمیں بھی اس میں شامل ہیں) اس کو عوامی مقبولیت حاصل تھی لیکن ان کا یہ رنگ آخیر میں بدل گیا۔ مذہب کے زیرِ اثر وہ شاعر سے زیادہ ناصح بن گئے۔

میرے دوست کا موقف بہت اہم اور فکر انگیز ہے۔ یہ مہمیز کا کام دیتا ہے۔ ابھی تک تو ہر کس و ناکس اقبال کو ایک عظیم فلسفی کہتا ہے گو کہ وہ نہیں جانتا کہ فلسفہ اور فلسفی کیا ہوتا ہے۔ میرے دوست کی گفتگو سے جو مسائل پیدا ہوئے ہیں وہ مندرجہ ہیں:

i کیا اقبال فلسفی تھے؟ اس کے لیے یہ جاننا ہوگا کہ فلسفہ کیا ہے؟

ii ہم اقبال کو ایک عظیم شاعر کہہ سکتے ہیں لیکن ان کی شاعری کے ذریعے سے ان کے فلسفہ کو نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔

iii اقبال نے نثر میں فلسفہ کی کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی جس سے ان کے فلسفہ کو مرتب کیا جا سکے۔ ان کے خطبات الجھے ہوئے ہیں بعض جگہ ان میں تضاد ہے۔

iv انہوں نے عظیم فلسفیوں کی طرح کوئی نیا فلسفہ پیش نہیں کیا۔

v مغربی فلسفیوں پر شعر کی زبان میں تنقید کرنا اور ہے اور نثر میں ان کا مدلل جواب دینا اور بات ہے۔

vi اقبال کے فلسفۂ خودی کو وجودی معنی اگر پہنائے جائیں تو یہ ایک نئی بات ہوگی۔

vii کیا اقبال کو عوامی اور قومی شاعر کہا جا سکتا ہے؟

آیئے اب ان مسائل کا حل ڈھونڈیں۔ سب سے پہلے یہ معلوم کریں کہ فلسفہ کیا ہے۔

## ۱۔ فلسفہ کیا ہے؟

اگر علم کی بڑی تقسیم کی جائے تو اس کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک اس دنیا یعنی اس کے مظاہر کا علم جس میں دنیا کے تمام سائنسی علوم اور فنون آجاتے ہیں جیسے طبعیات، کیمیا، ارضیات، معاشیات، سیاسیات، نفسیات، عمرانیات، مصوری، موسیقی، سنگتر اشی، ادب وغیرہ۔ دوسرا علم وہ ہے جو کائنات کے مظاہر کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقت کو دریافت کرتا ہے۔ یہ علم ہمیں مظاہر سے پرے لے جاتا ہے۔ ان مسائل میں خدا، روح، حیات بعد موت، خیر و شر وغیرہ کے مسائل آتے ہیں۔ ان مسائل کو مابعد الطبیعیاتی مسائل کہا جاتا ہے جو فلسفہ کے اصل مسائل ہیں۔ مابعد الطبیعیاتی مسائل پر زور دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فلسفی اس دنیا کے مسائل سے بے توجہی برتتا ہے۔ وہ اس دنیا کے مسائل پر بھی نظر ڈالتا ہے۔ مارکس کے نزدیک تو اصل کام اس دنیا کو سمجھنا نہیں ہے بلکہ بدلنا ہے (بغیر سمجھے ہوئے بدلنا نہیں بلکہ سمجھ کر بدلنا) اس میں فلسفی اور سائنسداں میں ایک فرق ہے۔ سائنسدان دنیا میں کھو جاتا ہے (اقبال کی آفاق میں گم ہونے والی بات) فلسفی اس سے آگے جانا چاہتا ہے (گم اس میں ہیں آفاق)۔ وہ دنیا کا رشتہ حقیقت مطلق سے جوڑنا چاہتا ہے۔ ولیم جیمس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "جب میں کلاس میں فلسفیانہ مسائل سے بحث کرتا ہوں تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ میں نے ان مسائل کو حل کر لیا لیکن جب کلاس سے باہر آتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مسائل جوں کے توں موجود ہیں۔"

کانٹ کے بعد سب ہی فلسفی اس بات پر متفق ہیں کہ ہم حس اور عقل کے ذریعے علم حاصل کرتے ہیں لیکن عقل کے ذریعے سے مابعد الطبیعیاتی مسائل کو نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ حقیقت عقل کے دائرے سے باہر ہے۔ یہ ایمان بالغیب کی دنیا ہے۔ بعض کے نزدیک اس کو وجدان کے ذریعے جانا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے فلسفہ وہ علم ہے جو ہمیں حقیقت کی تلاش میں مدد دیتا ہے (یہ کہنا کہ فلسفہ ہمیں حقیقت کا علم بہم پہنچاتا ہے ایک متنازعہ مسئلہ ہے)۔ یہ انسان، کائنات اور حقیقت مطلق کو ایک رشتے میں پروتا ہے اور ان تینوں کے درمیان تعلق کا پتہ چلاتا ہے۔ افلاطون کے نزدیک تو "فلسفی تمام زمان و مکان کا ناظر ہے۔" اس تعریف کی روشنی میں ہم کو یہ دیکھنا ہوگا کہ اقبال نے انسان، کائنات اور خدا کے رشتوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے؟ کیا وہ حیات و موت اور خیر و شر کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں؟ کیا وہ دوسرے فلسفیانہ خیالات سے متفق ہیں یا ان سے اختلاف کرتے ہیں، کیا ان کے تصورات میں کوئی نیا پن ہے؟ ہم دیکھیں گے کہ ان کے یہاں ان سب تصورات سے بحث کی گئی ہے۔ یہ بحث نثر میں کم ہے لیکن شاعری میں اس کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔

اقبال کے یہاں تمام مابعد الطبیعیاتی مسائل سے بحث کی گئی ہے جیسے مذہب کی اہمیت اور عبادت کے معنی،

مذہبی تجربے کا امکان اور وحی کی حقیقت، خدا، انسان اور کائنات کا تعلق، وجدان کی اہمیت، کیا وجدان عقل کے مقابلے میں ہمیں حقیقت کا عرفان دے سکتا ہے؟ کائنات اور اس کی تسخیر، مجہول فکر کے مقابلے میں عمل، تغیر کا ادراک، حریت اور ابدیت کی بحث، روح کی ماہیت، مسلم ثقافت اور خودی کا تصور۔ خودی کے تصور کی ذرا تفصیل ضروری ہے۔ ذات یا انا کے متعلق بحث بہت پرانی ہے۔ مشرق اور مغرب کے تمام فلسفیوں نے اس پہ مختلف انداز سے بحث کی ہے۔ فلسفہ کا زیادہ تر محور ذات کی ماہیت رہا ہے جس کو اقبال نے نہیں چھیڑا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ذات جسم یا روح ہے یا ان دونوں کا مجموعہ ہے یا ان سے الگ کوئی چیز ہے؟ اقبال ذات کی حقیقت کو مان کر اس سے بحث کرتے ہیں۔ خودی کس طرح مستحکم ہو سکتی ہے؟ کن عناصر سے وہ مضبوط اور کن سے وہ کمزور ہوتی ہے؟ خودی کا سادہ سا اظہار خود اعتمادی اور خودداری ہے۔ انسان اگر اپنی صلاحیتوں کا اندازہ کر لے اور ان سے کام لے تو وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ مسلمان میں اگر خود اعتمادی اور عزم و ہمت ہو تو وہ دنیا میں بے پناہ ترقی کر سکتا ہے۔ ذات اپنے ارتقا میں خدا کی نائب اور ایک کامل انسان بننا چاہتی ہے۔ وہی اس کی معراج ہے۔ ذات کا تعلق ملت سے بھی ہے۔ فرد معاشرے کا حصہ ہوتا ہے اس لیے اسکو ملت اسلامیہ کی تشکیل و تعمیر میں بھرپور حصہ لینا چاہیے۔ اقبال کے نزدیک جدید دور کے تقاضوں اور اسلامی اصولوں کی روشنی میں فرد ملت کے لیے اہم خدمات انجام دے سکتا ہے۔

مومن کے لیے یہ دنیا ایک آزمائش گاہ ہے۔ وہ خدا کا سپاہی اور نیکی کا محافظ ہے۔ وہ شر کی قوتوں سے برسر پیکار رہے۔ اعتماد، عزم و ہمت سے اثباتِ ذات ہوتا ہے اور احساس کمتری اور ضعف سے نفیِ ذات ہوتی ہے۔ خودی کو عشق سے استحکام ملتا ہے اور تخلیقی مقاصد سے اس کو تقویت ہوتی ہے۔ غرض اقبال خودی کے تصور سے اپنی پوری فکر کا تانا بانا بنتے ہیں۔

فلسفہ دوسرے تمام علوم سے اس لیے مختلف ہے کہ وہ بنیادی سوالات اٹھاتا ہے جو دوسرے علوم کا موضوع نہیں ہیں۔ مثلاً طبیعیات کے نزدیک مادے کا وجود ہے۔ وہ اس کے وجود کو تسلیم کر کے آگے بڑھتی ہے۔ طبیعیات مادے کی ماہیت کے متعلق بنیادی سوالات نہیں اٹھاتی ہے۔ مادے کا اصل جوہر atom ہے۔ جوہر کی ماہیت کی بحث سائنسی فلسفہ بن جاتی ہے۔ طبیعیات میں مادے سے متعلق تجربات پر زور دیا جاتا ہے۔ اسی طرح حیاتیات زندگی کو مان کر آگے بڑھتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ زندگی کیسے پیدا ہوئی؟ کیا وہ بے جان مادے سے نکلی یا اس کا اپنا الگ ایک وجود ہے؟ اگر تصورِ ارتقا کو مان لیا جائے تو زندگی نے مختلف صورتیں کیسے اختیار کیں؟ نباتات، حیوانات اور انسان میں زندگی مشترک ہے لیکن ان کی صورتیں مختلف ہیں۔ نباتات میں نشوونما ہے، حیوانات میں حرکت ہے اور انسان میں شعور ہے۔ پھر ایک بنیادی سوال جو برگساں نے اٹھایا تھا وہ یہ ہے کہ ارتقا میکانکی ہے یا تخلیقی؟ فلسفہ ان ہی بنیادی سوالوں سے بحث کرتا ہے۔ وہ نظریۂ ارتقا کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے۔ طبیعیات کے ان مختلف نظریات سے بحث کرتا ہے جس سے کائنات کی

تخلیق اور اس کے ارتقا پر روشنی پڑتی ہے۔ میکانکی اور تخلیقی ارتقا کے فرق کو واضح کرتا ہے۔

## ii۔ اقبال ایک عظیم شاعر

دوسرا سوال یہ ہے کہ اقبال کو ایک عظیم شاعر تو کہا جا سکتا ہے لیکن ان کی شاعری سے ان کے فلسفے کو نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ابتدا سے لے کر اب تک فلسفہ کی زبان نثر رہی ہے۔ چند مستثنیات ہیں جیسے لوکریٹس نے جو کہ روم کا فلسفی تھا اپنا فلسفہ ایک نظم میں پیش کیا۔ مولانا رومؒ کی مثنوی فلسفیانہ تصورات سے پُر ہے۔ افلاطون نے گو نثر میں شاعری کی لیکن آخرکار وہ نثر ہی ہے۔ نثر میں فائدہ یہ ہے کہ خیالات اور نظریات کو واضح طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے دلائل دیے جا سکتے ہیں اور اعتراضات کا جواب بھی دیا جا سکتا ہے۔ شاعری میں اس اعتبار سے فلسفیانہ تصورات کو نظم کرنا مشکل ہے۔ اقبال نے نظم میں جہاں مکالمات سے کام لیا ہے (ابلیس اور خدا) وہاں تفصیل سے روشنی پڑتی ہے اور بات بن جاتی ہے۔

اس ضمن میں جو دوسرا مسئلہ کھڑا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر شاعری کے ذریعے فلسفہ کو مرتب کیا جائے تو پھر میرؔ، غالبؔ شیکسپیئر، گوئٹے وغیرہ سب فلسفی ٹھہرے لیکن ہم ان کو فلسفی کے بجائے شاعر کہتے ہیں۔ فلسفی اور شاعر میں بہرحال ایک حد فاصل کھینچنی ہوگی۔ یہی حال نثر کا ہے۔ ٹالسٹائی، چارلس ڈکنس، فلابیئر، زولا وغیرہ جیسے ناول نگار بھی فلسفی ٹھہرائے جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ فلسفیانہ خیالات نثر یعنی ناول، افسانہ، ڈرامہ میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ آج کل وجودیت کو ماننے والے ادب کا سہارا لے رہے ہیں۔ در اصل وجودیت ادب ہی کے سہارے پھلی پھولی ہے۔ اس کا سہرا سارتر کے سر ہے جو فلسفی تھا اور اس نے اپنے فلسفیانہ خیالات اپنی کتاب "ہستی اور نیستی" ——— Being and Nothingness ——— میں پیش کیے ہیں۔ شاعری اور فلسفہ کی حد فاصل تو یہ ہے کہ افلاطون، برکلے، کانٹ فلسفی ہیں شاعر نہیں ہیں، غالبؔ، گوئٹے شاعر ہیں فلسفی نہیں ہیں۔ صرف اقبال کی ایسی شخصیت ہے جو کہ دونوں پر حاوی ہے۔ میرا خیال ہے کہ نثر کے بجائے نظم میں اقبال اپنے خیالات کا بہتر اور موثر طور پر اظہار کر سکتے تھے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ شعر کہتے وقت ان پر ایک کیفیت سی طاری ہوتی تھی اردو سے زیادہ ان کو فارسی پر قدرت حاصل تھی۔ فارسی کے ذریعے وہ بین الاقوامی سطح پر اپنے خیالات کی نشر و اشاعت چاہتے تھے۔ اگر وہ فلسفہ نہ پڑھتے تو شاید وہ اسی قسم کی شاعری کرتے جو اُن کے ابتدائی کلام میں تھی۔ فلسفہ نے ان کی فکر کو جلا بخشی اور انہوں نے اس فکر کو شاعری میں سمو دیا۔

اُردو شاعری میں فلسفیانہ خیالات (متصوفانہ) ملتے ہیں جیسے دنیا کی بے ثباتی، ہمہ اوست و ہمہ از اوست کا نظریہ، اپنی اور کائنات کی حقیقت وغیرہ۔ بہت سے شاعروں نے ان کو نظم کیا ہے۔ غالبؔ نے ان تصورات سے شاعری کو فکر انگیز بنایا۔ میر دردؔ کے یہاں تصوف نے جگہ پائی لیکن ان شاعروں نے ان مسائل پر پوری طرح توجہ نہیں دی اور ان سے بحث نہیں کی۔ اس لیے ان کی شاعری میں ان کا سرسری سا ذکر ملتا ہے۔ اس اعتبار سے کسی فلسفیانہ خیال کو نظم کر دینا فلسفہ

نہیں ہے۔ فلسفہ میں جس طرح کسی مسئلہ کا جائزہ لیا جاتا ہے ایسا شاعری میں ممکن نہیں ہے۔ اقبال نے چونکہ فلسفہ پڑھا تھا پڑھایا تھا اور اس میں اعلیٰ ڈگری لی تھی اس لیے وہ اس کے مسائل سے پوری طرح واقف تھے۔ جب وہ نطشے کے انسان اعلیٰ کا جائزہ ایک شعر میں لیتے ہیں اور اسے مقام کبریائی سمجھانا چاہتے ہیں تو ایک فلسفہ کا طالب علم ہی اس کو شرح و بسط کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ نطشے کے انسان اعلیٰ کو سمجھے بغیر اقبال کی تنقید سمجھ میں نہیں آسکتی ہے۔ وہ یہاں مقام کبریائی کی تشریح نہیں کرتے ہیں کیونکہ شعر اس کا متحمل نہیں ہوسکتا ہے۔ ہمیں ان کے اس تصور کو دوسری جگہ تلاش کرنا پڑتا ہے۔ یہی بات ان کی تمام نظموں میں ہے جس میں انھوں نے مغرب کے فلسفیوں یا سیاست دانوں سے خطاب کیا ہے۔ غرض ہمیں اقبال کے فلسفے کو مرتب کرنے کے لیے ان کے تمام کلام کو کھنگالنا ہوگا۔ اشعار سے پوری بات نہیں بنتی ہے۔ ایجاز سے بات سمجھ میں آتی ہے لیکن فلسفہ ہر موقف کی تشریح چاہتا ہے اور اس کے لیے دلائل کا متقاضی ہوتا ہے۔

## iii۔ نثر میں فلسفہ

تیسری اہم بات یہ ہے کہ اقبال نے اپنے فلسفہ کو پورے شرح و بسط کے ساتھ نثر میں نہیں لکھا ہے۔ ان کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ "ایران میں مابعد الطبیعیات کی ترقی" اور ان کے "خطبات" اہم نثری تصانیف ہیں۔ اس میں خطبات چونکہ آخری عمر میں لکھے گئے ہیں اس لیے یہ بہت اہم ہیں۔ اس کے علاوہ وہ خطوط ہیں جن سے فلسفیانہ مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔

اقبال کے فلسفہ میں ان کے "خطبات" کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ وہ ان کی فکر کا نچوڑ ہیں۔ ان کی فکر اور شاعری میں جتنے موڑ آئے وہ ان میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جو الجھنیں ہیں ان کا پتہ چلتا ہے۔ مغرب کے تصورات سے وہ کس حد تک متاثر ہیں کس حد تک ان کو قبول یا رد کرتے ہیں یہ سب ان خطبات میں ہے۔ یہ کتاب آسان نہیں مشکل ہے۔ اس کے مسائل مشکل ہیں اور انداز بیان مشکل ہے۔ وہ جب مشرق اور مغرب کے افکار میں کسی قسم کی مطابقت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ان کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جس شخص کو فلسفہ سے واقفیت نہ ہو اس کے لیے ان کو سمجھنا اور بھی مشکل ہے۔ خود فلسفہ سے واقفیت رکھنے والوں کے لیے بہت سے مشکل مقامات آتے ہیں۔ پروفیسر بی۔ ایچ۔ ہورانی نے جو مشی گن یونیورسٹی اناربر (امریکہ) میں مرکز مشرق اوسط میں پروفیسر تھے اقبال کو پڑھاتے وقت مجھ سے کہا تھا کہ اقبال کی زماں کی بحث کو وہ ان کے انگریزی خطبات سے نہیں سمجھ سکے۔ اس کو انھوں نے اس کے فرانسیسی ترجمے کے ذریعے سے سمجھا۔ اقبال کے خیالات الجھے ہوئے تھے اور وہ زماں کی بحث کو پوری طرح سے سمجھا نہیں سکے تھے۔ الجھن کی ایک مثال اور ہے۔ خطبات میں "ذات انسانی کی حریت اور ابدیت" کی بحث میں اقبال ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "جنت اور دوزخ مقامات نہیں کیفیات ہیں" یہاں پر وہ اس خیال کے حامی ہیں کہ اگر ہم دوسری دنیا میں پھر سے پیدا کیے گئے تو وہاں ہمارا دنیا والا مادی جسم نہ ہوگا بلکہ کسی اور قسم کا جسم ہوگا (جسم کے بجائے روح ہوگی)۔ جنت اور دوزخ کو متشابہات سمجھنے والا ایک مکتبہ فکر اسلام میں رہا ہے۔ یہ نقطہ نظر ہمارے

یہاں معراج والے واقعہ سے چلتا ہے کہ حضورؐ کی معراج جسمانی تھی یا روحانی۔ ہندوستان میں اس کی ابتدا سرسید نے کی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہ عقل کے ذریعے سے مذہب کو سمجھنا چاہتے ہیں اور مذہبی عقائد کی ایسی تاویل کرنا چاہتے ہیں جس سے وہ جدید معلوم ہوں۔ سرسید 'جن' کے معنی 'جرثومہ' لیتے ہیں۔ وہ درخت جس سے آدم علیہ السلام نے پھل کھایا تھا 'علم کا درخت' کہا جاتا ہے (عیسائی اور یہودی روایات ایسی ہی ہیں)۔ اسلام کی ابتدا میں معتزلہ اور اشاعرہ میں بہت سے متنازعہ مسائل تھے جیسے خدا کی ذات وصفات کا مسئلہ، کائنات قدیم ہے حادث، مسئلہ جبر واختیار اور قرآن کے خلق کا مسئلہ۔ ابن رشد اس خیال کا حامی تھا کہ قرآن کے دو معنی ہیں ایک ظاہری اور دوسرے باطنی۔ ظاہری معنی وہ ہیں جو لوگ ظاہر آزبان وبیان سے لیتے ہیں یعنی الفاظ کے جو معنی ہوتے ہیں۔ باطنی معنی کچھ اور ہیں جو چند لوگوں پر منکشف ہوتے ہیں (جیسے جنت اور دوزخ متشابہات ہیں)۔

قطع نظر اس بات کے کہ کون کیا کہتا ہے اگر ہم قرآن میں آدم کی تخلیق اور جنت اور دوزخ کا ذکر دیکھیں تو اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ جنت اور دوزخ کیفیات ہیں۔ اقبال نے ایک جگہ لکھا ہے "آدم ایک تصور ہے"۔ قرآن کی رُو سے تو آدم کو اللہ نے مٹی سے بنایا تھا۔ پھر خدا نے اس میں روح پھونکی تھی۔ اگر جنت اور دوزخ محض کیفیات ہوتے تو اللہ تعالےٰ قرآن میں ایک جملہ بڑھا دیتا کہ یہ سب باتیں عوام کو سمجھانے کے لیے ہیں۔ جنت اور دوزخ محض کیفیات ہیں اور ان کا حقیقی وجود نہیں ہے۔ جس درخت سے آدم نے پھل کھایا تھا اس کو علم کا درخت کہنا محل نظر ہے کیونکہ آدم کو چیزوں کے نام پھل کھانے سے پہلے بتائے گئے تھے جبکہ فرشتوں کے مقابلے میں آدم نے چیزوں کے نام گنوا دیے تھے۔

سرسید کے دلائل کے لیے جو مشکل ہے وہی اقبال کے لیے بھی ہے۔ اگر ایک مرتبہ آدم، جنت اور دوزخ کو تصورات مان لیا جائے تو بات آگے ہی بڑھتی چلی جائے گی۔ فرشتوں، روح خدا کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ حضورؐ اُمّی تھے اس لیے کیسے پڑھ سکتے تھے؟ قرآن کو الہامی کیونکر سمجھا جائے؟ جبرئیل علیہ السلام (جو ایک تصور بن جاتے ہیں) کس طرح وحی لا سکتے تھے؟ اس طرح قرآن میں جو کچھ ہے وہ تنقید کا نشانہ بنے گا۔ عقلی دلائل کو ایک بار قبول کرنے کا یہ منطقی نتیجہ نکلے گا جس سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔ سرسید یا اقبال یہ نہیں کہہ سکتے کہ خدا اور رسولؐ کو مان کر وہ باقی چیزوں کی ایسی توجیح کر سکتے ہیں۔ اس کی لپیٹ میں تو سب ہی تصور آ جائیں گے۔

## ۱۷- نیا فلسفہ

اب سوال یہ ہے کہ کیا اقبال کو عظیم فلسفیوں کی صف میں کھڑا کیا جا سکتا ہے؟ فلسفیوں کو ہم مختلف درجات میں بانٹ سکتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ جنھوں نے کوئی نیا نظام فلسفہ دیا۔ اس میں افلاطون، لاک، برکلے، ہیوم، کانٹ ہیگل، مارکس وغیرہ آتے ہیں۔ ان کے بعد دوسرے درجے کے فلسفی آتے ہیں جو کہ بڑے فلسفیوں کے خوشہ چیں ہوتے

ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں کہتے ہیں بلکہ پچھلوں کی باتوں میں سے کسی ایک یا ایک سے زائد پہلو پر زور دیتے ہیں۔ یہ بڑے فلسفیوں کے شارح ہوتے ہیں۔ ان میں سقراط، افلاطون اور ارسطو کے بعد کے یونانی فلسفی، کانٹ، ہیگل، اور مارکس کے شارح آتے ہیں۔ بڑے فلسفیوں کے اندازِ فکر کو ایک مثال سے واضح کروں گا۔

لاک نے مادے کی تعریف اس کی بنیادی اور ثانوی صفات کے تعلق سے کی۔ اس کے نزدیک بنیادی صفات حجم، وزن، پھیلاؤ، ٹھوس پن وغیرہ ہیں جو کہ اشیاء میں موجود ہوتی ہیں۔ یہ صفات مادی ہیں۔ رنگ، ذائقہ، بو، آواز۔ وغیرہ ثانوی صفات ہیں جو کہ اشیاء اور ذہن کے تعلق سے سمجھی جاتی ہیں یعنی ذہن محسوسات کے ذریعے ان صفات کو جانتا ہے اس لیے یہ صفات کسی حد تک ذہنی ہیں۔ برکلے نے جو کہ مادیت کا دشمن تھا (عیسائی پادری ہونے کی وجہ سے) اور مادیت کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا چاہتا تھا نے کہا کہ مادے کا وجود نہیں ہے۔ اشیاء کا وجود ہے اور اشیاء مادی نہیں بلکہ ذہنی ہیں۔ اس کے نزدیک بنیادی صفات بھی ذہنی ہیں۔ مثلاً پہاڑ دور سے چھوٹا اور نزدیک بڑا معلوم ہوتا ہے۔ اونچائی سے مکانات اور موٹریں ماچس کی ڈبیا نظر آتی ہیں۔ اس کے خیال میں بنیادی صفات کسی بھی صورت میں مادی نہیں ہیں کیونکہ بغیر ذہن کے کسی شے کا علم نہیں ہو سکتا ہے۔ چیزوں کا وجود اس لیے ہے کہ کوئی نہ کوئی ذہن ان کو دیکھ رہا ہے۔ پوری کائنات اس لیے موجود ہے کہ خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔

جس طرح برکلے نے مادے کو غائب کیا ہیوم نے ذہن کو غائب کر دیا۔ برکلے کے نزدیک مادہ ہمارے تجربے میں نہیں آتا ہے۔ صرف اشیاء اور ان کی بنیادی اور ثانوی صفات ہمارے تجربے میں آتی ہیں اور یہ سب صفات ذہنی ہیں۔ خالص مادے کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ہیوم نے کہا کہ جس طرح مادہ ہمارے تجربے میں نہیں آتا ہے اسی طرح ذہن بھی ہمارے تجربے میں نہیں آتا ہے۔ جب ہم ذہن کا ادراک کرتے ہیں تو وہ ایک لمحاتی تاثر معلوم ہوتا ہے جو کہ آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ ذہن بحیثیت مجموعی کبھی ہمارے تجربے میں نہیں آتا ہے۔ ذہن دراصل ان تاثرات کا ایک سیل رواں ہے۔ اس کے بعد کانٹ نے بہت دقتِ نظر سے مادے اور ذہن دونوں کی جداگانہ حیثیت متعین کی اور کہا کہ دونوں کا وجود ہے اور دونوں ایک دوسرے کو ختم نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ تفصیل میں نے اس لیے دی کہ آپ کو فلسفیانہ مسائل اور ان کے مباحث کا اندازہ ہو جائے۔ لاک، برکلے، ہیوم اور کانٹ نے فلسفیانہ فکر کی عظیم بنیادیں رکھیں۔ مادے اور ذہن کے مسئلہ کو ایک نئے انداز سے پیش کیا اور آئندہ مباحث کی راہیں استوار کیں اس لیے ان کو عظیم فلسفی کہا جاتا ہے۔

دوسرے درجے کے فلسفیوں میں وہ آتے ہیں جو کہ بڑے فلسفیوں کے خوشہ چیں ہوتے ہیں (جیسے سقراط، افلاطون، ارسطو، کے بعد آنے والے فلسفی، ہیگل کے پیروکار، مارکس کے ماننے والے وغیرہ)۔ وہ کوئی نئی بات نہیں کہتے ہیں بلکہ اپنے پیش روؤں کے فلسفہ میں کانٹ چھانٹ کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں ابن سینا، فارابی، غزالی، ابن رشد، ابن عربی کے علاوہ دوسرے مفکرین دوسرے درجے پر ہیں۔ عیسائی مفکرین میں سینٹ آگسٹائن اور سینٹ اکیوی ناس صف اوّل میں

آتے ہیں۔

اقبال یقیناً ان فلسفیوں کی صف میں نہیں آتے ہیں جن کو عظیم کہا جاتا ہے۔ انہوں نے فلسفہ میں کوئی نئی راہ نہیں نکالی اور نہ مسائل کا کوئی نیا حل پیش کیا۔ جہاں تک اسلامی فکر کا تعلق ہے اس کے متعلق دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ بعض کے نزدیک وہ غزالی اور ابن رشد کے پائے کے فلسفی ہیں اور بعض کے نزدیک نہیں ہیں۔ غزالی اور ابن رشد کی شہرت اور عظمت ان کے فلسفہ کی وجہ سے تھی لیکن اقبال کی عظمت ان کی شاعری کی وجہ سے ہے۔ سیاسی مفکرین اور معاشرتی مصلحین میں سرسید کو ایک بلند مرتبہ مقام حاصل ہے لیکن مسلمانوں کی جدوجہد آزادی اور پاکستان کی فکری راہ متعین کرنے میں اقبال کا بڑا ہاتھ ہے۔ پاکستان ان کے تصور کا نتیجہ ہے۔ جہاں تک فلسفیانہ تصورات اور مسائل کا تعلق ہے انہوں نے مشرق اور مغرب کے امتزاج سے ایک درمیانی راہ نکالی جو وقت کا تقاضا تھی۔ انہوں نے عمل اور پیہم عمل پر زور دیا۔ تغیر اور ترقی پر نظر رکھی مادی ترقی کے ساتھ روحانی ترقی کو بھی ضروری سمجھا۔ وہ اس تصوف کے مخالف ہیں جو کہ ہمیں خانقاہوں میں بٹھا دے اور زندگی کی جدوجہد سے دور کر دے۔ وہ اس ملا سے بھی نالاں ہیں جو کہ مغربی علوم سے بے بہرہ ہے اور صرف پرانی روایات اور تصورات میں کھویا ہوا ہے۔ لیکن ان سب کے اظہار کے لیے انہوں نے شاعری سے کام لیا ہے اور اسے خبر و پیغمبری بنا دیا۔ اس اعتبار سے وہ اردو ادب میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان سے پہلے نہ ان کا کوئی مثل تھا اور نہ آئندہ کوئی مدمقابل نظر آتا ہے۔

اقبال میں فلسفی اور شاعر اس طرح پیوست ہیں کہ ایک دوسرے کو الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ درحقیقت ایک کے بغیر دوسرے کی کوئی حیثیت بھی نہیں ہے۔ اقبال اگر صرف فلسفی یا صرف شاعر ہوتے تو وہ بات نہ بنتی جو ہے۔ مغربی فلسفیوں پر شعر کی زبان میں تنقید کرنا اور ہے اور نثر میں مدلل جواب دینا اور بات ہے۔ اقبال کے جوابات ان کے خطبات میں بھی ہیں لیکن ان کو سمجھنا مشکل ہے۔ فلسفہ کا طالب علم ہی کسی حد تک سمجھ سکتا ہے۔ اقبال جا بجا تاریخی حوالے دیتے ہیں۔ ان کو جانے بغیر ان کی شاعری اور فکر کو سمجھا نہیں جا سکتا ہے۔

## ۱۷۔ قومی شاعر

اقبال کا زیادہ تر فلسفیانہ کلام فارسی میں ہے اور اس کے ذریعے سے وہ مغرب میں متعارف ہونا چاہتے تھے۔ ابتدائی اردو کلام سہل اور فطرت کے قریب ہے۔ بچوں کی نظموں میں بہت حسن اور رچاؤ ہے۔ وہ بچوں کی نفسیات کی عکاسی کرتی ہیں۔ بعد کے فارسی آمیز اردو کلام میں فکر کی گہرائی اور مذہب کا اثر ہے۔ اگر اقبال کے قومی/عوامی شاعر ہونے سے مراد اشتراکی معنویت ہے تو وہ ان معنی میں قومی شاعر نہ تھے لیکن اپنے پورے کلام سے انہوں نے مسلمان قوم کو ایک نئی راہ سجھائی۔ نئی منزل اور نئے جذبوں کی نشاندہی کی، قوم کی تربیت کی اور اسلامی فکر کے تانے بانے بُنے۔ اس لحاظ سے وہ ایک قومی

شاعر ہیں۔ انہوں نے پاکستان کی فکری بنیادیں رکھیں اور سیاست دانوں نے اسے ایک عملی صورت دے دی

## (۷) فلسفہ خودی

میرے دوست کے نزدیک اقبال کا تصور خودی بہت اہم ہے۔ اس تصور کو ہم اگر اسلامی فکر کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو ہمیں کوئی نئی بات نہیں ملتی ہے لیکن اگر اسے موجودہ وجودی فکر کے روشنی میں دیکھیں تو یہ نئی بات ہوگی۔ میرے خیال میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ اقبال کا مردِ مومن نطشے، سارتر، ہائیڈیگر کے وجودی فلسفہ کو قبول نہ کر سکے گا۔ اقبال کا مردِ کامل مولانا روم کا شاگرد ہو سکتا ہے یا خلفائے راشدین کی مثال بن سکتا ہے۔ وجودی فلسفہ کی روشنی میں خودی کا تجزیہ یقیناً ایک اچھی کوشش ہوگی لیکن یہ تجزیہ اقبال سے اتنا ہی دور ہوگا جتنی اشتراکی فکر اقبال سے دور ہے۔ اقبال وجودیوں سے بعض تصورات میں متفق نظر آتے ہیں جیسے انسانی ارادے کی آزادی، حریت فکر، جدوجہد پیہم، تغیر، خودی۔ انسان کی آزادی کا سرچشمہ اس کا شعور ہے۔ وجودی اسے 'داخلیت' کہتے ہیں۔ اقبال اس کو خودی کہتے ہیں۔ لیکن اقبال کی خودی کا محور اسلام ہے۔ خودی کی ابتدا و انتہا رضائے الٰہی ہے۔ اس اعتبار سے مغربی وجودی فکر اقبال کی فکر سے یکسر مختلف ہے۔ ان کی بنیادیں مختلف اور راستے الگ الگ ہیں گو بعض تصورات دونوں میں یکجا ہو جاتے ہیں۔

مسلمانوں میں فکری قحط کے دور میں اقبال کی ذات بہت غنیمت ہے۔ وہ فلسفی بھی تھے عظیم نہ سہی، لیکن عظیم شاعر ضرور تھے۔

---

لہ Heaven and Hell are states not locations.

خطبات ص۔ ۱۲۳ - ایڈیشن ۱۹۶۵ء

آں فقر کہ بے تیغے صد کشور دل گیرد
از شوکتِ دارا بہ از فرِ فریدوں بہ

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006